آوازے پھولتے ہیں
عزیز نبیل

عزیز نبیل: مختصر تعارف

تخلص: عزیز نبیل   پیدائش: ۲۶ جون ۱۹۷۶ء

مکمل نام: عزیز الرحمن محمد صدیق انصاری

کتابیں:

۱۔ خواب سمندر۔ شعری مجموعہ (2011)

۲۔ فراق گورکھپوری شخصیت، شاعری اور شناخت (2014)

۳۔ عرفان صدیقی۔ حیات، خدمات اور شعری کائنات (2015)

۴۔ آنند نرائن ملاؔ۔ شخصیت اور فن (2016)

۵۔ پنڈت برج نرائن چکبست (2018)

۶۔ آواز کے پر کھلتے ہیں۔ شعری مجموعہ (2018)

۷۔ سالانہ کتابی سلسلہ "دستاویز" (ادارت 2010 تا حال)

اہم ادبی اعزازات:

۱۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی کا ساحر لدھیانوی ایوارڈ

۲۔ بہار اسٹیٹ اردو اکیڈمی کا عبدالغفور شہباز ایوارڈ

۳۔ اردو وراثت کارواں، فراق گورکھپوری ایوارڈ برائے شاعری

تنظیمی وابستگی:

۱۔ جنرل سکریٹری، انجمن محبانِ اردو ہند، قطر

۲۔ مشیر خاص، مجلس فخرِ بحرین برائے فروغِ اردو، بحرین

۳۔ مشیر خاص، انجمن فروغ ادب، کویت

 aziznabeelx@gmail.com

  +974-55296335

 www.facebook.com/aziz.nabeel .7

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آواز کے پر کھلتے ہیں

(غزلوں کا مجموعہ)

عزیز نبیل

تصنیف : آواز کے پر کھلتے ہیں
مصنف : عزیز نبیلؔ
سنِ اشاعت : 2018
تعداد : 700
قیمت : 250 روپے (-/50 ریال)
طباعت : حامدی پرنٹ پوائنٹ، نئی دہلی

ISBN No 978-81-932035-5-2

ناشر

اسکالر پبلشنگ ہاؤس
SCHOLAR PUBLISHING HOUSE
A-14/1,Second Floor Shaheen Bagh,
Abul Fazal enclave, Part 2 Jamia Nagar
New Delhi.110025-Mob:8130115854

انتساب

فائزہ کے نام

جس کی رفاقت کی خوشبو میرے تخلیقی وجدان کو
تازہ دم اور سرشار رکھتی ہے

......

زہیر، ہشام، صائم اور صہیب کے نام

جن کی شرارتوں کے معصوم رنگوں میں جذب ہو کر
میری زندگی جگمگا اٹھتی ہے

چند ٹوٹی صدائیں اٹھائے پھرے، شاعری کب ہوئی
ہاں مگر حرمتِ لفظ کا دائرہ ہم نے توڑا نہیں

ترتیب

عرض ناشر

عزیز نبیل کو پہلی بار میں نے انجمن شعراء اردو ہند کے مشاعرے میں سنا، اس وقت ادبی نشستیں ابراہیم کمال صاحب کے گھر پر منعقد ہوا کرتی تھیں، پہلی ہی ادبی نشست میں ان کی شاعری نے مجھے متاثر کیا اور میں ان کی شاعری کا گرویدہ ہو گیا مجھے اسی وقت ان کے لہجے میں ایک نیا پن محسوس ہوا تھا اور اندازہ ہو گیا تھا کہ ایک دن یہ آواز شاعری کے افق پر چمکے گی اور ہر دل پر دستک دے گی۔

دیکھتے ہی دیکھتے بیس اکیس سال کا طویل عرصہ بیت گیا اس عرصہ میں عزیز نبیل کی شاعری زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتی اور مختلف تجربات کو اپنے دامن میں سمیٹتے ہوئے توانا ہوتی گئی چنانچہ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'خواب سمندر 2011 میں شائع ہوا جو خاصا مقبول ہوا۔ اس کے بعد اب ان کا یہ دوسرا مجموعہ کلام 'آواز کے پر کھلتے ہیں' آپ کے سامنے ہے۔

عزیز نبیل بحیثیت شاعر آج پوری اردو دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ شعر کہتے نہیں ہیں شعر خلق کرتے ہیں اور ایسی خلاقی سے رمز و استعارہ کو لفظوں کی دہلیز پر چراغوں کی طرح سجا دیتے ہیں کہ ہر شعر لو دینے لگتا ہے اور اس کی آنچ سماعت و بصارت کے راستے سینوں پر اتر کر دلوں کو پگھلانے لگتی ہے۔ ان کے شعری اظہار میں حسن تازہ کی جھلک ہے۔ زبان و بیان میں ٹھہراؤ کے ساتھ رچاؤ بھی ہے۔ جو انہیں دوسرے شعراء سے

ممتاز کرتا ہے۔

اسکالر پبلشنگ ہاؤس جو کہ ایک نوزائیدہ ادارہ ہے۔ اس ادارے کے قیام کے پس پردہ تجارتی مقاصد بالکل بھی نہیں ہیں بلکہ یہ ادارہ اس جذبے کے تحت قائم کیا گیا ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کی سوچ اور فکر کو عروج اور ترقی کی طرف گامزن کرنے کی راہ نکالی جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں علمی تفوق کو سب سے اہم سمجھتے ہوئے ہماری کوشش ہے کہ اردو، انگریزی اور ہندی تینوں زبانوں میں علم وادب، فکر وفن اور بحث وتحقیق کے موتی چن چن کر پیش کیے جائیں تا کہ ایسے علمی مواد کا انتخاب منصۂ شہود پر آسکے جو لوگوں کے اندر سائنسی اندازِ نظر پیدا کرے، بحث وتحقیق کا جذبہ بیدار کرے اور اس ذہنی جمود کو توڑ سکے جس نے صدیوں سے ان کے ذہنوں کو زنگ آلود کر دیا ہے۔

شعروادب کے میدان میں بھی ہماری کوشش رہے گی کہ اچھے شعرا اور ادبا کی تخلیقات کو پیش کیا جائے، ادبِ عالیہ اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کو فروغ ہو اور ہماری آنے والی نسلیں اعلیٰ انسانی اقدار سے مزین ہو سکیں۔

ادارہ اسکالر پبلشنگ ہاؤس کے لیے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ وہ عزیز نبیلؔ صاحب کے دوسرے مجموعۂ کلام ''آواز کے پر کھلتے ہیں'' کو شائع کر رہا ہے اس یقین کے ساتھ کہ حلقۂ خاص وعام میں اس کی کماحقہ پزیرائی ہوگی۔ میں اسکالر پبلشنگ ہاؤس کی طرف سے عزیز نبیلؔ صاحب کو دوسرے شعری مجموعے کی اشاعت پر بھرپور مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

محمد شاہد خان

ڈائرکٹر

اسکالر پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

پیش لفظ

بچپن سے ہی کتابوں کا لمس مجھے بے خود کر دیتا تھا۔ سفید، مٹ میلے، نئے اور بوسیدہ اوراق سے پھوٹنے والی نادیدہ روشنی میری روح تک منور کر دیتی تھی۔ کتابوں کے انبار سے اپنے ذوق کی کتابیں ڈھونڈنا دلچسپ ترین مشغلہ تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ گویا کتب خانوں کی الماریوں، راہداریوں، دیواروں اور کتابوں کی قطاروں میں ہی میں بھی کہیں سانس لیتا ہوں۔ کتابوں سے والہانہ عشق نے کب تخلیقیت کے رمز مجھ پر وا کر دیے پتہ ہی نہیں چل سکا۔ پھر وہ دن بھی آیا جب ایک کتاب کے سرورق پر میرا نام تھا۔ ۲۰۱۱ء میں میرا پہلا شعری مجموعہ شائع ہوا، نام تھا ''خواب سمندر''۔ یعنی میرے خوابوں کے سمندر سے نمودار ہونے والی پہلی تعبیر اور میری تخلیقی جستجو کا نقشِ اوّل۔ زیرِ نظر مجموعہ ''خواب کے پر کھلتے ہیں'' نقشِ ثانی ہے۔

نقشِ ثانی کی آمد میں قدرے تاخیر ضرور ہوئی ہے لیکن کیا کیا جائے کہ میں نے شاعری کو نہ کبھی کام سمجھ کر اختیار کیا اور نہ کبھی وقت گزاری کا سامان جانا۔ میں نے تو کبھی اِس معمّے کو بھی حل کرنے کی کوشش نہیں کی کہ میں کیوں شعر کہتا ہوں اور کس کے لیے کہتا ہوں۔ ہاں، اِس بات پر شدت سے یقین رکھتا ہوں کہ شاعری کارِ زیاں نہیں ہے، نہ کارِ ارزاں ہے اور نہ ہی کارِ بے ہنراں بلکہ ایک تخلیقی صناعی ہے جس کا تعلق دل اور دماغ دونوں سے ہوتا ہے۔ یہ احساس اور جذبے کا ایسا پر کشش اظہاریہ ہے جس میں شعور و لاشعور کی پر کشش لہریں زندگی کی نمود کرتی ہیں۔ یہ جمالیات کا ایسا دل فریب منظر نامہ تخلیق

کرتی ہیں جس میں صحرا کی سلگتی ریت اور اس کے نم احساسات سے مکالمہ ہے، دریا کی بدمست موجوں پر رقم اَن کہی کہانیوں سے گفتگو کا سلسلہ ہے، رات کی نیلم پری سے راز و نیاز کی باتیں ہیں اور دن کے رنگ محل میں بکھرے ہوئے طلسمی مناظر کا بیان ہے، درونِ ذات کے حیرت کدے میں اپنی موجودگی کا یقین ہے اور کبھی ہمزاد کی تلاش میں نادیدہ منزلوں کی سمت نکل جانے کی جستجو ہے۔ غرض یہ کہ ذاتی تجربات، مشاہدات اور مطالعات کی ہزار جہت وسعتوں میں نمو پانے والے جذبات کو جب خوش خیالی، بلند فکری اور زبان و بیان کا تخلیقی نور عطا ہوتا ہے تب شاعری جنم لیتی ہے۔

ادب میں نیا پرانا اور جدید و قدیم کی بحث ہمیشہ رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ روایت پسند ہونا کسی بھی فنکار کی تخلیقیت کو مضبوط بنیاد اور عمیق تناظر فراہم کرتا ہے کیوں کہ روایت اور کلاسیک کی مضبوط جڑیں اپنے تہذیبی اور لسانی اثرات کے ساتھ ہماری زمینوں میں دور تک پیوست ہیں۔ تاہم یہی روایت پسندی جب روایت پرستی کی راہ پر جا نکلتی ہے تو فن کار کے تخلیقی وجدان پر جمود کا خطرہ منڈلانے لگتا ہے۔ ٹیکنالوجی، تہذیب اور رہن سہن کی طرح زبان اور اس کا ادب بھی ترقی کرتا ہے چنانچہ اگر کسی شاعری میں معاصر عہد کی رمزیت اور اشاریت، علامات اور کیفیات کا شعور نہ شامل ہو تو دیرپا، توانا، وسیع اور بڑے امکانات کی شاعری کا ظہور ممکن نہیں۔

زندگی مسلسل سفر سے عبارت ہے۔ مختلف حصاروں میں، معیاروں میں، مقداروں میں، راستوں میں، منزلوں میں انسان مسلسل سفر کرتا رہتا ہے۔ یہ سفر ایک مقام سے دوسرے مقام تک بھی ہوتا ہے اور ایک سانس سے اگلی سانس کی جانب بھی۔ ذہن کی کسی ایک سطح سے دوسری سطح کی طرف بھی اور کبھی ایک کتاب سے دوسری کتاب تک کا سفر۔ آواز کے پر کھلتے ہیں میرے تخلیقی سفر کا دوسرا قیام ہے یعنی میرا دوسرا ذہنی اور تخلیقی تجربہ، جس کے اوراق میں گزشتہ آٹھ برسوں کی شعری ریاضت کے نقوش شامل

ہیں، ایسے نقوش جن کے شب و روز میں لفظ اور خیال سے میری نسبتیں، آئندہ کے خواب، گزشتہ کی حقیقتیں، حکایتیں، حزن و ملال، فرحت و انبساط، محرومیاں، شب بیداریاں، آوارہ گردیاں اور وہ سب کچھ جن کا تعلق میری ذات سے اور میرے اطراف سے ہے۔
گویا کہ میں اس کتاب میں اپنی ذات کے نہاں خانوں سے باہر اور اپنی خاموشیوں سے بہت دور لفظ در لفظ، شعر در شعر اور غزل در غزل کہیں ادھورا، کہیں مکمل اور کہیں ٹوٹا پھوٹا موجود ہوں، اپنے وجود کی پوری دیانت، فکری سچائی اور تخلیقی قوت کے ساتھ۔

خواب سمندر کی آدھی ادھوری تعبیروں کے طلسم سے کھلنے والے آواز کے یہ پَر اگر کسی کے لبوں پر مسکراہٹ، آنکھوں میں چمک اور دل میں سکون کی ایک لہر بھی اتار سکیں تو میں سمجھوں گا کہ میرا فن کامیاب ہوا۔

گو کہ صرف شکریہ کہہ دینے سے میرے جذبۂ تشکّر کی تسکین نہیں ہوتی ہے مگر پھر بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ ہمدمِ دیرینہ آصف اعظمی، شاہد ذکی، فرتاش سید، قیصر مسعود، ندیم ماہر، زوار حسین زائر، عبید طاہر، آصف شفیع، اشفاق دیشمکھ، امتیاز خلیل، سید راشد حامدی صاحب، عبداللہ عباسی صاحب، ابراہیم خان کمال صاحب اور میرے بہت محترم شکیل احمد صبرحدی صاحب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے 'آواز کے پر کھلتے ہیں' کی غزلوں پر نظرِ ثانی سے لے کر طباعت تک کے مختلف مراحل میں اپنے مخلصانہ مشوروں سے نوازا۔ مخلص دوست شاہد خان (ڈائریکٹر اسکالر پبلشنگ ہاؤس) کا تہہِ دل سے شکریہ کہ جنہوں نے ایک غیر منافع بخش سودا کرتے ہوئے میری کتاب شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ محترم شمس الرحمن فاروقی، محترم افتخار عارف اور محترم سید محمد اشرف کے لیے بہت سراپا سپاس ہوں کہ انہوں نے میری شاعری پر اپنی گراں قدر آرا لکھ کر میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

عزیز نبیلؔ

عادتاً میں کسی احساس کے پیچھے لپکا
دفعتاً ایک غزل دشتِ سخن سے نکلی

سلسلے نور کے 'میں خاک نشیں' جانتا ہوں
کتنے سورج ہیں یہاں زیرِ زمیں جانتا ہوں

جان لیتا ہوں ہر اک چہرے کے پوشیدہ نقوش
تم سمجھتے ہو کہ میں کچھ بھی نہیں جانتا ہوں

بے صدا لمحوں میں، موہوم خیالوں سے پرے
دل کی آواز کو میں عین یقیں جانتا ہوں

کن علاقوں سے گزرنا ہے اٹھائے ہوئے سر
اور کہاں مجھ کو جھکانی ہے جبیں جانتا ہوں

اُس کے ہی حسن کی تمہید ہیں سارے موسم
میں اُسے آج بھی اُتنا ہی حسیں جانتا ہوں

لاکھ جا بیٹھے کوئی اونچی فصیلوں پہ نبیلؔ
جس کی اوقات جہاں کی ہو ، وہیں جانتا ہوں

عجب کشش ہے پسِ اسمِ ذات چلتی ہوئی
طویل سجدے میں ہے کائنات چلتی ہوئی

ملی تھی راہ میں اک بے قرار پرچھائیں
گھر آ گئی ہے مرے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی

طلوعِ صبح سے پہلے غروبِ شام کے بعد
ٹھہر گئی مرے سینے میں رات چلتی ہوئی

سو میں نے بحث نہ کی ، گفتگو کو ختم کیا
نکل گئی تھی بہت دور بات چلتی ہوئی

بچھڑ گیا تھا وہیں وقت ساتھ چلتا ہوا
بھٹک گئی تھی جہاں کائنات چلتی ہوئی

کچھ اس طرح سے صدا دی ہے اک نظر نے نبیلؔ
ٹھٹھک کے رک گئی جیسے حیات چلتی ہوئی

وہی جو رشتہ ہے کشتی کا سطحِ آب کے ساتھ
وہی ہے میرا تعلّق بھی اپنے خواب کے ساتھ

یہیں کہیں تو چمکتی تھی اک طلسمی جھیل
یہیں کہیں تو میں ڈوبا تھا اپنے خواب کے ساتھ

چھلک رہی تھی کسی انتظار کی چھاگل
بھٹک رہی تھی کہیں پیاس اضطراب کے ساتھ

الجھ رہی تھی مسلسل سوال کی لکنت
مکالمہ نہ کوئی ہوسکا جواب کے ساتھ

ہر ایک حرف ستارہ ، ہر ایک لفظ چراغ
میں نور نور ہوا رات کی کتاب کے ساتھ

یہ کس کے لمس کی بارش میں رنگ رنگ ہوں میں
یہ کون مجھ سے گزرتا ہے آب و تاب کے ساتھ

سنبھل کے چلنا، یہ تعبیر کی سڑک ہے میاں
بندھی ہوئی کئی آنکھیں ہیں ایک خواب کے ساتھ

میں ریت ہونے ہی والا تھا جب عزیز نبیلؔ
امیدِ آب دھڑکنے لگی سراب کے ساتھ

کوئی فریاد مجھے توڑ کے سَن سے نکلی
یوں لگا جیسے مری روح بدن سے نکلی

عادتاً میں کسی احساس کے پیچھے لپکا
دفعتاً ایک غزل دشتِ سخن سے نکلی

رنگ کس کا تھا جو دستک سے نمودار ہوا
کس کی خوشبو تھی جو کمرے کی گھٹن سے نکلی

کس کا چہرہ تھا جو صدیوں کے بھنور سے ابھرا
کیسی وحشت تھی جو برسوں کی تھکن سے نکلی

ایک سائے کے تعاقب میں کوئی پرچھائیں
پیاس اوڑھے ہوئے صحرائے بدن سے نکلی

کچھ تو ایسا تھا کہ بنیاد سے ہجرت کرلی
خاک یونہی تو نہیں اپنے وطن سے نکلی

راکھ جمنے لگی جب رات کی آنکھوں میں نبیلؔ
نیند آہستہ سے بستر کی شکن سے نکلی

بے سبب ہی سہی، آواز لگاؤ تو سہی
اپنے ہونے کا کچھ احساس دلاؤ تو سہی

سانس لیتا ہوا ہر رنگ نظر آئے گا
تم کسی روز مرے رنگ میں آؤ تو سہی

تاکہ پھر رات کی تصویر اتاری جائے
اِن چراغوں کو ذرا دیر بجھاؤ تو سہی

حوصلہ ہے تو جزیرہ بھی تمہارا ہوگا
خوف کی کشتیاں ساحل پہ جلاؤ تو سہی

زندگی جسم سے باہر بھی نظر آئے کبھی
کوئی ہنگامہ سرِ راہ اٹھاؤ تو سہی

میری مٹّی میں محبت ہی محبت ہے نبیلؔ
چھو کے دیکھو تو سہی ، ہاتھ لگاؤ تو سہی

دل پہ کچھ ایسے کسی یاد کے در کھلتے ہیں
جیسے صحراؤں کی وسعت میں سفر کھلتے ہیں

ہم سے ملتے ہیں سرِ دشت بگولے جھک کر
پاؤں دریاؤں میں رکھیں تو بھنور کھلتے ہیں

راہ گم کردہ ستاروں کے لیے آخرِ شب
ہم فقیرانِ درِ عشق کے گھر کھلتے ہیں

کون سے لوگ ہیں جو پھرتے ہیں تعبیر لیے
کن دعاؤں کے لیے بابِ اثر کھلتے ہیں

آگ تخلیق کی جب روح کو لاوا کر دے
تب کہیں جا کے مری جان، ہنر کھلتے ہیں

روز دستک سی کوئی دیتا ہے سینے پہ نبیلؔ
روز مجھ میں کسی آواز کے پر کھلتے ہیں

پرندے جھیل پر اک ربطِ روحانی میں آئے ہیں
کسی بچھڑے ہوئے موسم کی حیرانی میں آئے ہیں

مسلسل دھند، ہلکی روشنی، بھیگے ہوئے منظر
یہ کن برسی ہوئی آنکھوں کی نگرانی میں آئے ہیں

کئی ساحل یہاں ڈوبے، کئی گرداب ٹوٹے ہیں
کئی طوفاں اسی ٹھہرے ہوئے پانی میں آئے ہیں

نظر بھر کر اسے دیکھو تو یوں محسوس ہوتا ہے
ہزاروں رنگ اک چہرے کی تابانی میں آئے ہیں

میں جن لمحوں کے سائے میں تمہارے پاس پہنچا ہوں
وہ لمحے سجدہ بن کر میری پیشانی میں آئے ہیں

یہ کس وحشت زدہ لمحے میں داخل ہو گئے ہیں
ہم اپنے آپ کے مدِ مقابل ہو گئے ہیں

کئی آنکھیں یکایک ہو گئی ہیں مجھ میں روشن
کئی لہجے مرے لہجے میں شامل ہو گئے ہیں

وہ کچھ پل جن کی ٹھنڈی چھاؤں میں تم ہو ہمارے
وہی کچھ پل تو جیون بھر کا حاصل ہو گئے ہیں

خدا کے نام سے طوفان میں کشتی اتاری
بھنور جتنے سمندر میں تھے ، ساحل ہوگئے ہیں

الجھتے جا رہے ہیں جستجو کے پر مسلسل
زمیں تا آسماں کتنے مسائل ہوگئے ہیں

نبیلؔ آواز بھی اپنی کہاں تھی مدّتوں سے
جو تم آئے تو ہم یکلخت محفل ہوگئے ہیں

نئے جہانوں کے خواب آنکھوں میں پل رہے ہیں
نئے ستارے پرانے رستے بدل رہے ہیں

یہ کس کا عکسِ جمال روشن ہے میرے آگے
مری نگاہوں کے آئنے کیوں پگھل رہے ہیں

مری روانی میں ڈھل چکے ہیں بہت سے دریا
بہت سے صحرا مری رفاقت میں چل رہے ہیں

وہ روشنی جو تمہارے اطراف بڑھ رہی ہے
وہ خواب سارے جو میری پلکوں پہ جل رہے ہیں

اے شامِ تنہا! تجھے خبر ہی نہیں ہے شاید
تری گلی سے اداس رستے نکل رہے ہیں

سیاہِ شب کی صفوں میں کہرام مچ رہا ہے
چراغ جب سے ہوا کی آنکھوں میں جل رہے ہیں

وہی تو غرقاب ہونے والے ہیں، دیکھ لینا!
جو بیچ دریا ، نبیلؔ کشتی بدل رہے ہیں

بہتا ہوں میں دریا کی روانی سے کہیں دور
اک پیاس مجھے لائی تھی پانی سے کہیں دور

اک اور بھی دنیا ہے کہیں دور زمیں سے
اک اور بدن ہے تنِ فانی سے کہیں دور

یادوں کی اڑن طشتری لے آئی ہے مجھ کو
دھرتی سے الگ ، خطِ زمانی سے کہیں دور

آنکھیں تھیں ، نیا خواب تھا اور نیند تھی ، میں تھا
اے رات تری جھوٹی کہانی سے کہیں دور

گزرا ہے مرا سایہ ابھی چھوڑ کے مجھ کو
بے سائباں لمحوں کی گرانی سے کہیں دور

خاموشیٔ اظہار میں پلتی ہوئی شورش
سہمے ہوئے الفاظ ، معانی سے کہیں دور

مسافتیں کسی ہجرت کے انتظار میں ہیں
عقیدتیں ابھی بیعت کے انتظار میں ہیں

سرائے عشق میں بیٹھے ہوئے ہیں دل والے
اور ایک آخری تہمت کے انتظار میں ہیں

یہ کون لوگ ہیں جو لے کے نامۂ اعمال
نہ جانے کب سے قیامت کے انتظار میں ہیں

یہاں کی خاک میں سورج دبے ہوئے ہیں کئی
اور آسماں کی رفاقت کے انتظار میں ہیں

نبیلؔ کھول دو شہرِ سخن کے دروازے
بہت سی غزلیں اجازت کے انتظار میں ہیں

زمین آنکھوں کو مَل رہی تھی، ہوا کا کوئی نشاں نہیں تھا
تمام سمتیں سلگ رہی تھیں مگر کہیں بھی دھواں نہیں تھا

چراغ کی تھرتھراتی لو میں، ہر اوس قطرے میں، ہر کرن میں
تمھاری آنکھیں کہاں نہیں تھیں، تمہارا چہرہ کہاں نہیں تھا

دیارِ ہجراں کی وحشتوں کا طلسم ٹوٹا تو میں نے جانا
ہر ایک دستک ہواؤں میں تھی، مکیں نہیں تھے، مکاں نہیں تھا

وہ ایک لمحہ تھا سرخوشی کا، فسوں تھا دریافت کے سفر کا
جو ریگِ جاں میں چمک رہا تھا ستارہ آسماں نہیں تھا

وہ کیسا موسم تھا، زرد شاخوں سے سبز بیلیں لپٹ رہی تھیں
وہ سبز بیلیں کہ جن کی آنکھوں میں کوئی خوفِ خزاں نہیں تھا

یگوں کے رتھ پر سوار گہری خموشیوں نے بتایا مجھ کو
کہ تم سے پہلے بھی اور پہلے بھی بس یقیں تھا گماں نہیں تھا

اسی زمیں کی تہوں میں بہتا تھا میٹھے پانی کا ایک چشمہ
سراب زادوں کی تشنگی کو مگر کچھ اس کا گماں نہیں تھا

سرِ صحرائے جاں ہم چاک دامانی بھی کرتے ہیں
ضرورت آ پڑے تو ریت کو پانی بھی کرتے ہیں

کبھی دریا اٹھا لاتے ہیں اپنی ٹوٹی کشتی میں
کبھی اک قطرۂ شبنم سے طغیانی بھی کرتے ہیں

ہمیشہ آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پہ رکھتے ہیں
مگر یہ یاد رکھیے گا کہ من مانی بھی کرتے ہیں

میاں تم دوست بن کر جو ہمارے ساتھ کرتے ہو
وہی سب کچھ ہمارے دشمنِ جانی بھی کرتے ہیں

یہ کیا قاتل ہیں، پہلے قتل کرتے ہیں محبّت کا
پھر اس کے بعد اظہارِ پشیمانی بھی کرتے ہیں

کبھی ایسا کہ آنکھوں میں نہیں رکھتے ہیں کوئی خواب
کبھی یوں ہے کہ خوابوں کی فراوانی بھی کرتے ہیں

تجھے تعمیر کرلینا تو اک آسان سا فن ہے
رفاقت کے محل ہم تیری دربانی بھی کرتے ہیں

آسیب سا جیسے مرے اعصاب سے نکلا
یہ کون دبے پاؤں مرے خواب سے نکلا

جب جال مچھیرے نے سمیٹا ہے، علی الصبح
ٹوٹا ہوا اک چاند بھی تالاب سے نکلا

سینے میں دبی چیخ بدن توڑ کے نکلی
یادوں کا دھواں روح کی محراب سے نکلا

مٹھی میں چھپائے ہوئے کچھ عکس، کئی راز
میں اس کی کہانی کے ہر اک باب سے نکلا

آواز مجھے دینے لگی تھی مری مٹی
میں خود کو سمیٹے ہوئے مہتاب سے نکلا

کچھ تہمت و دشنام ، شکایات و سوالات
کیا کچھ نہ میاں حلقۂ احباب سے نکلا

سیاہ شب کے اثر سے نکل رہے ہو کیا
ستارو! تم بھی مرے ساتھ چل رہے ہو کیا

وہ جارہا تھا تو روکا نہیں اُسے تم نے
وہ جاچکا ہے تو اب ہاتھ مل رہے ہو کیا

بجھی بجھی سی یہ باتیں، دھواں دھواں لہجہ
کسی عذاب میں اندر سے جل رہے ہو کیا

تمہیں تو آج کی شب میرا قتل کرنا تھا
کہاں چلے ہو؟ ارادہ بدل رہے ہو کیا

یہ کیا سفر ہے، کبھی ختم ہی نہیں ہوتا
نبیلؔ ! سمتِ مخالف میں چل رہے ہو کیا

جانے کس لمس کی تاثیر سے پتھر ہوا میں
ایک ٹھہری ہوئی دنیا کا پیمبر ہوا میں

صاحبِ دنیا کبھی مست قلندر ہوا میں
الغرض جو بھی ہوا اپنے ہی اندر ہوا میں

اَن گنت صدیوں کی ٹھوکر ہے مرے سینے پر
ایک دو دن میں نہیں میل کا پتھر ہوا میں

مجھ میں بل کھاتی ہوئی لہروں کو محدود نہ جان
کٹ کے خود اپنے کناروں سے سمندر ہوا میں

اپنے ہی لوگوں سے اِس بار لڑایا گیا ہے
اپنی ہی لاش اٹھانے پہ مقرّر ہوا میں

آپ آئے ہیں تو آئی ہے مری جان میں جان
ایسا لگتا ہے کہ کچھ پہلے سے بہتر ہوا میں

اجنبی ہوتی ہوئی آنکھیں یہ کیا جانیں نبیلؔ
پھر کسی خواب کی حیرت سے منوّر ہوا میں

میری خاک میں ایسے اک صد رنگ ستارا چلتا ہے
جیسے دھوپ کے آئینے میں کوئی سایہ چلتا ہے

ہر لہجے کی خاموشی میں جھڑتی ہے آواز کی راکھ
ہر سینے میں ریت اڑاتا درد کا صحرا چلتا ہے

دیواروں سے سایے نکلے آئینوں سے عکس اڑے
جانے کون سی آنکھیں ہیں وہ جن کا اشارا چلتا ہے

تم نے تو بس دور سے دنیا دیکھی ہے تم کیا جانو
مجھ سے پوچھو کیسی کیسی چال زمانہ چلتا ہے

بول جمورے! کن آنکھوں میں خوابوں نے خودسوزی کی
آنکھیں مت جھپکانا لوگو ابھی تماشا چلتا ہے

یوں لگتا ہے ساری دنیا بند ہے میری مٹھی میں
جس دم میری انگلی پکڑے میرا بیٹا چلتا ہے

یوں ہی وہ بھی پوچھتا ہے، تم کیسے ہو؟ کس حال میں ہو؟
یوں ہی میں بھی کہہ دیتا ہوں 'سب کچھ اچھا چلتا ہے'

اُس بستی کے لوگوں کو کیا دل کی بات بتائیں نبیلؔ
جس بستی کے بازاروں میں کھوٹا سکّہ چلتا ہے

خامشی ٹوٹے گی ، آواز کا پتّھر بھی تو ہو
جس قدر شور ہے اندر ، کبھی باہر بھی تو ہو

بجھ چکے راستے ، سنّاٹا ہوا، رات ڈھلی
لوٹ کر ہم بھی چلے جائیں مگر گھر بھی تو ہو

بزدلوں سے میں کوئی معرکہ جیتوں بھی تو کیا
کوئی لشکر مری جرأت کے برابر بھی تو ہو

مسکرانا کسے اچھا نہیں لگتا اے دوست!
مسکرانے کا کوئی لمحہ میسّر بھی تو ہو

رات آئے گی، نئے خواب بھی اتریں گے، مگر
نیند اور آنکھ کا رشتہ کبھی بہتر بھی تو ہو

چھوڑکر خواب کا سیارہ کہاں جاؤں نبیلؔ
کرۂ شب پہ کوئی جاگتا منظر بھی تو ہو

آئنے کی سلوٹوں سے پھر ابھر آیا ہوں میں
مدّتوں کے بعد، خود کو بھی نظر آیا ہوں میں

ایک بنجر سی زمیں تھی جس پہ میرا رنگ ہے
ایک خالی آسماں تھا جس کو بھر آیا ہوں میں

دل چٹخنے کی صدا رکھ دی ہے تیرے اردگرد
دیکھ تیرے قہقہوں میں کیسے در آیا ہوں میں

صبح کو پایا ہے دروازے پہ اپنا منتظر
شام کے پہلو بہ پہلو جب بھی گھر آیا ہوں میں

نیند کے گہرے سمندر کا سفر درپیش تھا
خواب کے پہلے جزیرے پر اتر آیا ہوں میں

حرف و صدا لپیٹے ہوئے گوشہ گیر ہوں
میں خانقاہِ شعر و سخن کا فقیر ہوں

شاید کہ کوئی آ کے تراشے مرا وجود
اک سنگِ انتظار میں کب سے اسیر ہوں

آ دیکھ! میری آنکھ میں چہرے ہیں بے شمار
تنہا نہیں کھڑا ہوں ، میں جمِ غفیر ہوں

سر پر اٹھائے پھرتا ہوں ہجرت کی گٹھریاں
میں رہگزارِ عشق کا اک راہ گیر ہوں

تیری عبادتوں کو خبر ہی نہیں کہ میں
تیری ہتھیلیوں میں دعا کی لکیر ہوں

لوگوں سے اتنا پیار ملا ہے کہ اب نبیلؔ
دنیا وسیع تر ہے مری ، میں امیر ہوں

طلسمِ خواب میں بے خواب آئینہ ہے کوئی
نکل کے مجھ سے ابھی اِس میں کھوگیا ہے کوئی

جو ہنس رہا ہے بہت دوستوں کے حلقے میں
وہ میں نہیں ہوں، مرے جیسا دوسرا ہے کوئی

ہوا گزرتی ہے جب رات کا بدن چھوکر
لپٹ کے سوکھے درختوں سے چیختا ہے کوئی

میں آگے بڑھنے کا خود راستہ تمہیں دوں گا
بتاؤ تم کو اگر مجھ سے مسئلہ ہے کوئی

شدید کرب میں جب میں بھی اپنے پاس نہ تھا
یقین آیا ہے مجھ کو کہ ہاں خدا ہے کوئی

دیے کی مسلی ہوئی لَو نے مجھ کو بتلایا
مرے علاوہ بھی کل شب یہاں رہا ہے کوئی

زمیں یہاں کی ہمیشہ ہی نم ملے گی نبیلؔ
ہماری آنکھ میں دریا کا راستہ ہے کوئی

عجیب طرح کی کشمکش ہے، کہیں کا ہو کر کہیں پڑا ہوں
میں اس طرف آ چکا ہوں لیکن، ابھی تلک اُس طرف کھڑا ہوں

کبھی جو خود سے ملے فراغت، تو اپنی آنکھوں سے پوچھ لینا
تمہارے خوابوں کے واسطے میں، خود اپنے خوابوں سے بھی لڑا ہوں

کبھی جو آواز دی ہے تم نے، نظر سے اوجھل، سفر سے آگے
میں اپنے سینے پہ رکھ کے پاؤں تمہاری جانب نکل پڑا ہوں

یہ میری سانسوں میں کن ہواؤں کی سرد مہری بسی ہوئی ہے
یہ کن رویّوں کی چکنی مٹّی ہے جس میں برسوں سے میں گڑا ہوں

کوئی سمندر سمٹ کے بولا کہ مجھ کو کوزہ میں بند کر لو
اور ایک قطرے کو زعم یہ تھا کہ میں سمندر سے بھی بڑا ہوں

یہ کیسی ضد ہے، یہ کیا جنوں ہے، نبیلؔ کیا ہو گیا ہے مجھ کو
بس ایک ہی دھن سوار سر پر، بس ایک ہی بات پر اڑا ہوں

نہ روح سے دھواں اٹھا ، نہ آنکھ ہی لہو ہوئی
یہ کس طلب کی چاندنی میں رات سرخ رو ہوئی

میں اپنی ذات کا سفر تمام کرکے رک گیا
پھر اس کے بعد راستوں سے میری گفتگو ہوئی

ہمیں تو اپنی جستجو بھی خود سے دور لے گئی
تمہاری جستجو تو پھر تمہاری جستجو ہوئی

زمیں ٹھہر ٹھہر گئی، فلک سمٹ سمٹ گیا
کوئی صدائے نیم جان ایسے کو بکو ہوئی

ہر ایک آنکھ ریت تھی ہر ایک دل سراب تھا
مگر وہ ایک تشنگی جو مجھ میں آب جو ہوئی

رات کا تاریک جنگل اور یہ آوارگی
راستے آنکھوں سے اوجھل اور یہ آوارگی

جانے کس انجام تک پہنچے مسافت کی تھکن
نیند ہر پل، جسم بوجھل اور یہ آوارگی

سرد موسم، تیز بارش، اور لمبی رات ہے
راہ دلدل ، گاؤں جل تھل اور یہ آوارگی

دیر تک رہنا ہے تنہا ، شہر کی سڑکوں میں گم
وقت بے کل، میں ہوں پیدل اور یہ آوارگی

پیاس کا بے انت موسم روح تک اترا ہوا
ریت، صحرا، خشک چھاگل اور یہ آوارگی

روشنی پی کر ستارے اک مسلسل رقص میں
میں ہوں اور اک خالی بوتل اور یہ آوارگی

ساتھ میرے چل رہی ہیں اجنبی پرچھائیاں
ہر طرف بے نام ہلچل اور یہ آوارگی

رات دن کے سلسلوں سے ماورا آوارگاں
تم بھی پاگل ، میں بھی پاگل اور یہ آوارگی

دھوئیں میں لپٹی ہوئی کہکشاں اٹھائے ہوئے
چراغ چلتے رہے زخمِ جاں اٹھائے ہوئے

مگر کسی نے تمہاری طرح نہیں روکا
میں جارہا تھا دلِ رائگاں اٹھائے ہوئے

گزر رہا ہوں کسی خواب کے علاقے سے
زمیں سمیٹے ہوئے، آسماں اٹھائے ہوئے

مجھے پکار رہا تھا کوئی مرے جیسا
مری ہی طرح غمِ دوستاں اٹھائے ہوئے

ستارے ڈوب گئے آسماں کی آنکھوں میں
سلگتی رات کا سارا دھواں اٹھائے ہوئے

کوئی بگولا کسی نقشِ پا کی حیرت میں
رکا ہے دشتِ یقیں میں گماں اٹھائے ہوئے

ہے میرے چاروں طرف اک ہجومِ ہم شکلاں
نمود و نام کی کچھ تختیاں اٹھائے ہوئے

یہ وقت ایک سمندر ہے جس کے بیچ میں ہم
کھڑے ہیں عمر کی موجِ رواں اٹھائے ہوئے

یہ بات غیر یقینی بھی ہے یقینی بھی
زمین والے نے کی ہے فلک نشینی بھی

تمام رات تھا سورج مری ہتھیلی پر
چڑھے گا دن تو کروں گا ستارہ بینی بھی

اسی کی چشمِ کشادہ میں رنگ بنتے ہیں
اسی پہ ختم ہے قامت بھی مہ جبینی بھی

میں خود ہی اپنا تماشا بناؤں گا اک دن
اور اس کے بعد کروں گا تماش بینی بھی

مجھے ہی رکھنی پڑی کینوس پہ جاں اپنی
مجھے ہی کرنی پڑی نقش آفرینی بھی

کروں گا ثبت سخن در سخن ہنر اپنا
کروں گا اپنے ہی شعروں پہ نکتہ چینی بھی

بڑے قریب سے دیکھا ہوا ہے میں نے اِسے
بہت حسین ہے دنیا، بہت کمینی بھی

ستارہ وار سفر ہورہا ہے میرا نبیلؔ
مجھے تو راس بہت آئی بے زمینی بھی

رائگاں کرکے ہر اک اپنی نشانی میں نے
خود سے کرلی ہے کہیں نقل مکانی میں نے

خشک ہوتے ہوئے دو تنہا کناروں کی قسم
ٹوٹتے دیکھی ہے دریا کی روانی میں نے

میں نے اک صبحِ نشاط اپنے بدن پر مل لی
آنکھ سے باندھ لی اک رات سہانی میں نے

کیا ضروری ہے کہ ہر بات تمہاری مانوں
بات اپنی بھی کئی بار نہ مانی میں نے

وہ جو اک شخص مرے ساتھ کبھی تھا ہی نہیں
خود کو سمجھا ہے نبیلؔ اس کی زبانی میں نے

میں اک پرندہ ہوں جلتے شجر سے لپٹا ہوا
ہے سارا باغ مرے بال و پر سے لپٹا ہوا

سمٹنے لگتے ہیں مجھ میں ہر ایک شخص کے خواب
کوئی طلسم ہے میری نظر سے لپٹا ہوا

مجھے نہ روک میں درویشِ عشق و مستی ہوں
بدن سے روح تلک ہوں سفر سے لپٹا ہوا

کہیں بھی جاتا ہوں گھر ساتھ ساتھ چلتا ہے
عجب طرح کا تعلق ہے گھر سے لپٹا ہوا

کسی چراغ کا سینہ یہاں جلا ہوگا
دھوئیں کا رنگ ہے دیوار و در سے لپٹا ہوا

زمیں کی بیڑیاں پیروں میں شور کرتی ہیں
اور آسمان کا ہے جال سر سے لپٹا ہوا

میں گن رہا تھا سمندر کی آخری سانسیں
سفینہ ڈوب رہا تھا بھنور سے لپٹا ہوا

دشت و صحرا میں سمندر میں سفر ہے میرا
رنگ پھیلا ہوا تا حدِ نظر ہے میرا

آج تک اپنی ہی تردید کیے جاتا ہوں
آج تک میرے خد و خال میں ڈر ہے میرا

تو نے اِس بار تو بس مار ہی ڈالا تھا مجھے
میں ہوں زندہ تو مری جان ہنر ہے میرا

شاعری، عشق، غمِ رزق، کتابیں، گھربار
کتنی سمتوں میں بیک وقت گزر ہے میرا

نہیں معلوم ، اُسے اِس کی خبر ہے کہ نہیں
وہ کسی اور کا چہرہ ہے، مگر ہے میرا

باغباں ایسا ، کہ مٹّی میں ملا بیٹھا ہوں
شاخ در شاخ درختوں پہ اثر ہے میرا

آئیں گے نظر صبح کے آثار میں ہم لوگ
بیٹھے ہیں ابھی پردۂ اسرار میں ہم لوگ

لائے گئے پہلے تو سرِ دشتِ اجازت
مارے گئے پھر وادیِ انکار میں ہم لوگ

اک منظرِ حیرت میں فنا ہوگئیں آنکھیں
آئے تھے کسی موسمِ دیدار میں ہم لوگ

ہر رنگ ہمارا ہے، ہر اک رنگ میں ہم ہیں
تصویر ہوئے وقت کی رفتار میں ہم لوگ

یہ خاک نشینی ہے بہت ، ظلِ الٰہی!
جچتے ہی نہیں جبہ و دستار میں ہم لوگ

اب یوں ہے کہ اک وصل کا ماتم ہے شب و روز
چنوائے گئے ہجر کی دیوار میں ہم لوگ

سنتے تھے کہ بکتے ہیں یہاں خواب سنہرے
پھرتے ہیں ترے شہر کے بازار میں ہم لوگ

ایسے چمکا ہے ترے لمس کی تاثیر کا رنگ
خود بخود رنگ بدلنے لگا تصویر کا رنگ

معبدِ ذات میں مہکی ہے دعا کی خوشبو
حجرۂ خواب میں روشن ہوا تعبیر کا رنگ

مجھ میں کس جنگ کا آغاز ہوا چاہتا ہے
کیوں چمکتا ہے مری آنکھ میں شمشیر کا رنگ

پاس آتے ہوئے منظر کا گریزاں لمحہ
بھر گیا آنکھ میں اک موسمِ تاخیر کا رنگ

سرخ ہونے لگی مقتل کی زمینِ پرشور
زرد پڑنے لگا ہر حلقۂ زنجیر کا رنگ

میرے ہر حرف میں یہ کیسی بغاوت ہے نبیلؔ
کیوں جدا لگتا ہے مجھ سے مری تحریر کا رنگ

مسلسل آنکھ میں پانی مچلتا رہتا ہے
نہ جانے کیا ہے جو مجھ میں پگھلتا رہتا ہے

ادھر ادھر سے مجھے کاٹتا ہے اک دریا
یہاں وہاں سے کنارہ نکلتا رہتا ہے

مرے چراغ سے کرلی ہے گفتگو جب سے
یہ آئنہ کسی حیرت میں جلتا رہتا ہے

یہی گماں ہوا اکثر کہ اس کو جان لیا
مگر وہ شخص تو چہرہ بدلتا رہتا ہے

یہ کون ہے مری آوارگی کے صحرا میں
سفر میں رہتے ہوئے ہاتھ ملتا رہتا ہے

یہ کوہِ خواب ہے جو رات بھر فضاؤں میں
کسی کی یاد کا لاوا اگلتا رہتا ہے

نبیلؔ میں تو کہیں خود کو چھوڑ آیا تھا
یہ کس کا سایہ مرے ساتھ چلتا رہتا ہے

کبھی جنوب میں ہوں میں، کبھی شمال میں ہوں
کئی دنوں سے ستاروں کی الٹی چال میں ہوں

یہاں سے نکلوں تو پھر راستہ دکھائی دے
ابھی تو الجھا ہوا روشنی کے جال میں ہوں

یہ تم نہیں ہو تو پھر کون مجھ میں رہتا ہے
بہت دنوں سے مسلسل اسی خیال میں ہوں

وہ ایک لمحہ جو آیا نہیں ابھی مجھ تک
میں آج کل اسی لمحے کی دیکھ بھال میں ہوں

خبر نہیں ہے کہ کب تک قیام ہوگا یہاں
رکا ہوا کسی چہرے کے خدّ و خال میں ہوں

سبب پتہ نہیں ، بس اتنا جانتا ہوں کہ میں
بہت اداس ہوں اور موسمِ ملال میں ہوں

ہتھیلیوں سے لکیریں بھی مٹتی جاتی ہیں
نبیلؔ کیا میں کسی خطۂ زوال میں ہوں

ہر ایک سانس کا رکھنا ہے اب شمار مجھے
اتارنا ہے کوئی قرضِ انتظار مجھے

یہ کیا کہ ریت میں تبدیل ہو رہا ہے بدن
کہاں لیے ہوئے جاتا ہے ریگزار مجھے

میں اور کتنے ستاروں کو ڈوبتا دیکھوں
سیاہ رات کی کشتی سے اب اتار مجھے

بھنور صداؤں کے لپٹے ہوئے ہیں کانوں سے
بلانے والے! نئے ڈھنگ سے پکار مجھے

نکلنے دیتا نہیں مجھ کو میری وحشت سے
طلسمِ ہجر کا خودساختہ حصار مجھے

یہ کس نے مجھ کو پکارا گئے زمانوں سے
یہ کون کرنے لگا زیرِ اختیار مجھے

شکایتوں کا تسلسل ، نصیحتیں ہر دم
نبیلؔ مار ہی ڈالیں گے میرے یار مجھے

اک عجب طرح کی درپیش مسافت ہے مجھے
یعنی کچھ یوں ہے کہ اب تیری ضرورت ہے مجھے

اِن دنوں اور ہی کچھ حال ہے میرے دل کا
اِن دنوں اور ہی انداز کی وحشت ہے مجھے

آنے والوں کی محبت ہی بہت ہے مجھ کو
جانے والوں سے کہاں کوئی شکایت ہے مجھے

اس قدر پیار سے مت پوچھ مرا حال کہ میں
بندۂ عشق ہوں آزار کی عادت ہے مجھے

آپ تو خیر زمانے سے مجھے جانتے ہیں
آپ بھی ایسا سمجھتے ہیں تو حیرت ہے مجھے

اس کو معلوم نہیں ہے کہ میں سب جانتا ہوں
اور یہ جاننا خود ایک اذیّت ہے مجھے

مجھ کو لے جاؤ، کہیں چھوڑ کے آجاؤ نبیلؔ
میرے ہونے سے بھلا کون سی راحت ہے مجھے

اُس نے ہر سانس میں صدیوں کی مسافت رکھ دی
خواب در خواب مری آنکھ میں ہجرت رکھ دی

اپنے سب عیب چھپانے کے لیے یوں بھی ہوا
گرتی دیوار نے بنیاد پہ تہمت رکھ دی

ہاتھ خالی نہ تھے جب گھر سے روانہ ہوا مَیں
سب نے جھولی میں مری اپنی ضرورت رکھ دی

پاؤں بڑھتے ہیں نہ واپس ہی ہوا جاتا ہے
ہجر نے راہ میں یہ کیسی مصیبت رکھ دی

میں فلک زاد تھا سو اس نے مرے سینے میں
غیر آباد ستاروں کی سکونت رکھ دی

اپنی آواز سے ہر لفظ کو رخصت دے کر
میں نے پھر اس میں ترے نام کی آیت رکھ دی

مجھ کو تسخیر کیا، اور پھر اک دن اس نے
میری مٹھی میں نبیلؔ اپنی ریاست رکھ دی

نقش بر آب بنائے میں نے
نئے گرداب بنائے میں نے

چھوڑ کر مجھ کو اُسے جانا پڑا
ایسے اسباب بنائے میں نے

تیرے چہرے سے اجالا لے کر
چند مہتاب بنائے میں نے

یا تو یہ ہے کہ بنائے ہی نہیں
یا تو نایاب بنائے میں نے

روز دشمن ہوئی دنیا میری
روز احباب بنائے میں نے

رات کے چاک پہ تھی نیند نبیلؔ
کوزۂ خواب بنائے میں نے

یہ کس نے ہاتھ بڑھایا ہوا ہے میری طرف
مرے چراغ اڑے جا رہے ہیں کس کی طرف

یہ کس زمیں کی کشش کھینچتی ہے میرے قدم
یہ کون لوگ بلاتے ہیں مجھ کو اپنی طرف

سراب رنگوں کا پھیلا تھا یوں تو ہر جانب
مگر وہ رنگ جو آیا تھا اڑ کے میری طرف

مجھ اک نظر نے تمہیں دیر تک پکارا تھا
تمام شہر کی نظریں تھیں جب تمہاری طرف

رکھی ہوئی تھی کوئی تیغ میری گردن پر
لپک رہے تھے کئی تیر میرے سر کی طرف

بلا رہا تھا مسلسل سیاہ شب کا طلسم
کہر میں ڈوبے ہوئے جنگلوں کے اگلی طرف

سبھی رشتوں کے دروازے مقفل ہو رہے ہیں
ہمارے بیچ جو رستے تھے دلدل ہو رہے ہیں

ابھی تو دشت آئے گا، پھر اُس کے بعد جنگل
ابھی سے کیوں تمہارے پاؤں بوجھل ہو رہے ہیں

زمانے بعد سویا ہوں، مجھے سونے دو کچھ پل
ادھورے خواب تھے جتنے مکمل ہو رہے ہیں

یہ کیسی بے حسی کی دھول ہم پر چھا رہی ہے
خود اپنی زندگی سے ہم معطّل ہو رہے ہیں

تھکن اب آپ کی آنکھوں میں جمتی جا رہی ہے
سو اب ہم آپ کی نظروں سے اوجھل ہو رہے ہیں

نبیلؔ اترا ہے کیسا دل رُبا موسم ، زمیں پر
کہ جتنے نیم تھے بستی میں صندل ہو رہے ہیں

خیال و خواب کا سارا دھواں اتر چکا ہے
یقیں کے طاق میں سورج کوئی ٹھہر چکا ہے

مجھے اٹھا کے سمندر میں پھینکنے والے
یہ دیکھ ایک جزیرہ یہاں ابھر چکا ہے

ترے جواب کی امید جاں سے باندھے ہوئے
مرا سوال ہوا میں کہیں بکھر چکا ہے

وہ ایک نقش، جو اب تک نہ ہوسکا پورا
وہ ایک رنگ، جو تصویرِ جاں میں بھر چکا ہے

نہ تار تار ہے دامن ، نہ ہے گریباں چاک
عجیب شکل جنوں اختیار کر چکا ہے

مسافروں سے کہو اپنی پیاس باندھ رکھیں
سفر کی روح میں صحرا کوئی اتر چکا ہے

وہ جب کہ تجھ سے امیدیں تھیں میری دنیا کو
وہ وقت بیت چکا ہے وہ غم گزر چکا ہے

جھلک رہا ہے جو مجھ میں، وہ میں نہیں ہوں نبیلؔ
تجھے تلاش ہے جس کی وہ کب کا مر چکا ہے

جل رہی ہے ایک ٹھنڈی شام آتش دان میں
اور نمی پھیلی ہوئی ہے دل کے ریگستان میں

آنکھ میچے چل رہا ہوں پیاس کی آواز پر
بھر گیا ہے ریت کوئی دیدۂ حیران میں

گھل رہا ہے دھیرے دھیرے زہر میرے خون میں
آ رہی ہے رفتہ رفتہ جان میری جان میں

دل میں رکتے ہی نہیں ہیں اب تمناؤں کے عکس
پاؤں پڑتے ہی نہیں ہیں وادیِ امکان میں

میں زمیں کا گیت لکھنے جارہا ہوں دوستو!
آسماں اترا ہوا ہے آج میرے دھیان میں

مجھ کو اغوا کرلیا ہے میرے خوابوں نے نبیلؔ
اور مری آنکھیں انہیں مطلوب ہیں تاوان میں

ذرا سی دیر میں میرا گمان ٹوٹ گیا
دیا جلا بھی نہ تھا شمعدان ٹوٹ گیا

تمہارا ساتھ اگر ہو تو جوڑ سکتا ہوں
وہ سلسلہ جو سرِ داستان ٹوٹ گیا

بس اتنا جان لو رشتوں کو موت آئی تھی
یہ پھر بتائیں گے کیوں خاندان ٹوٹ گیا

وہ یوں گیا کہ کبھی لوٹ کر نہیں آیا
مکیں کے غم میں بالآخر مکان ٹوٹ گیا

یہ میری ذات کے معبد میں کس نے پاؤں رکھا
مہک اٹھے در و دیوار ، دھیان ٹوٹ گیا

یہ کس کے جاتے ہی چہروں پہ دھوپ آن پڑی
یہ کس کے ہجر میں ہر سائبان ٹوٹ گیا

کچھ دیر تو دنیا مرے پہلو میں کھڑی تھی
پھر تیر بنی اور کلیجے میں گڑی تھی

آنکھوں کی فصیلوں سے لہو پھوٹ رہا تھا
خوابوں کے جزیرے میں کوئی لاش پڑی تھی

سب رنگ نکل آئے تھے تصویر سے باہر
تصویر وہی جو مرے چہرے پہ جڑی تھی

میں چاند ہتھیلی پہ لیے جھوم رہا تھا
اور ٹوٹتے تاروں کی ہر اک سمت جھڑی تھی

الفاظ کسی سائے میں دَم لینے لگے تھے
آواز کے صحرا میں ابھی دھوپ کڑی تھی

پھر میں نے اُسے پیار کیا، دل میں اتارا
وہ شکل جو کمرے میں زمانے سے پڑی تھی

ہر شخص کے ہاتھوں میں تھا خود اُس کا گریباں
اک آگ تھی سانسوں میں، اذیّت کی گھڑی تھی

معجزے کا در کھلا اور اک عصا روشن ہوا
دور گہرے پانیوں میں راستہ روشن ہوا

جانے کتنے سورجوں کا فیض حاصل ہے اُسے
اُس مکمّل روشنی سے جو ملا روشن ہوا

مستقل اک بے یقینی، اک مسلسل انتظار
پھر اچانک ایک چہرہ جابجا روشن ہوا

آنکھ والوں نے چرالی روشنی ساری تو پھر
ایک اندھے کی ہتھیلی پر دیا روشن ہوا

ایک وحشت دائرہ در دائرہ پھرتی رہی
ایک صحرا سلسلہ در سلسلہ روشن ہوا

آج پھر جلنے لگے بیتے ہوئے کچھ خاص پل
آج پھر اک یاد کا آتش کدہ روشن ہوا

جانے کس عالم میں لکھی ہے غزل تم نے نبیلؔ
خامشی بجھنے لگی، شہرِ صدا روشن ہوا

یہ کس مقام پہ لایا گیا خدایا مجھے
کہ مجھ کو روند کے گزرا ہے میرا سایہ مجھے

میں جیسے وقت کے ہاتھوں میں اک خزانہ تھا
کسی نے کھودیا مجھ کو کسی نے پایا مجھے

میں ایک لمحہ تھا اور نیند کے حصار میں تھا
پھر ایک روز کسی خواب نے جگایا مجھے

اِسی زمیں نے ستارہ کیا ہے میرا وجود
سمجھ رہے ہیں زمیں والے کیوں پرایا مجھے

جہاں صداؤں کی خاموشیاں سلگتی ہیں
کسی خیال کی حیرت نے گنگنایا مجھے

نہ جانے کون ہوں، کس لمحۂ طلب میں ہوں
نبیلؔ چین سے جینا کبھی نہ آیا مجھے

اک انتظار کے لمحے بچھائے بیٹھا ہوں
سرائے درد میں ڈیرہ جمائے بیٹھا ہوں

نبیلؔ ریت میں سکّے تلاش کرتے ہوئے
میں اپنی پوری جوانی گنوائے بیٹھا ہوں

بہت طلب تھی مجھے روشنی میں رہنے کی
سو یوں ہوا ہے کہ آنکھیں جلائے بیٹھا ہوں

یہ دیکھو چاند، وہ سورج، وہ اُس طرف تارے
اک آسمان زمیں پر سجائے بیٹھا ہوں

یہ شہر کیا ہے نکلتا نہیں کوئی گھر سے
کئی دنوں سے تماشا لگائے بیٹھا ہوں

جو لوگ درد کے گاہک ہیں سامنے آئیں
ہر ایک گھاؤ سے پردہ اٹھائے بیٹھا ہوں

عجیب عالمِ وحشت ہے یہ عزیز نبیلؔ
میں ریگزار میں کشتی بنائے بیٹھا ہوں

جس طرف دیکھو ہزاروں سلسلے بیتاب ہیں
اک ہماری جستجو ہے اور ہم نایاب ہیں

روح کے اندھے کنویں میں جھانک کر پاؤ گے کیا
چند زخمی خواہشیں ہیں کچھ پرانے خواب ہیں

ہوش والوں سے کوئی کہہ دے کہ اپنے گھر کو جائیں
دشت میں آوارگی کرنے کے بھی آداب ہیں

بادلو! جا کر بجھاؤ پیاسے دریاؤں کی پیاس
ہم وہ صحرا ہیں جو اپنے آپ میں سیراب ہیں

صرف تم ہی تو نہیں تھے میرے جینے کا سبب
زندہ رہنے کے مری جاں! اور بھی اسباب ہیں

آنکھ سے دریا بہانے کا نتیجہ بھی تو دیکھ
خواب کے سارے علاقے آج زیرِ آب ہیں

ورنہ جس کو دیکھیے وہ دست بستہ ہے نبیلؔ
ہم ہی شاید شہر میں ناواقفِ آداب ہیں

میں نیند کے ایوان میں حیران تھا کل شب
اک خواب مری آنکھ کا مہمان تھا کل شب

کیا جانیے کیا اُس کی ندامت کا سبب تھا
کیا جانیے کیوں میں بھی پشیمان تھا کل شب

کس غم میں بکھرتے رہے آکاش پہ تارے
کیوں چاند پریشان پریشان تھا کل شب

پھر مجھ کو ہوئی صبحِ منوّر کی بشارت
پھر دور تلک راستہ آسان تھا کل شب

ہر آن کوئی یاد چمکتی رہی دل میں
ہر لمحہ کوئی شور تھا، طوفان تھا کل شب

اک نور تھا پھیلا ہوا اِس سمت سے اُس سمت
جگنو مری امید کی پہچان تھا کل شب

ٹھہری ہوئی لگتی تھی نبیلؔ ایسے ہر اک شے
جیسے کہ بدن وقت کا بے جان تھا کل شب

صحرا کی سمت ایک سمندر اچھال کر
میں آ رہا ہوں پیاس کو حیرت میں ڈال کر

ٹھہرا ہوا ہوں ، ہونے نہ ہونے کے درمیاں
اپنے بدن کی قید سے خود کو نکال کر

آؤ ذرا سی دیر سہی کھل کے مسکرائیں
دنیا کے مسئلوں کو پسِ پشت ڈال کر

پانی نہیں یہ بہتے ہوئے عکس ہیں میاں
دریا میں پاؤں رکھنا ذرا دیکھ بھال کر

ایسا نہ ہو کہ تو بھی بکھر جائے میرے ساتھ
مجھ کو مرے وجود میں فوراً بحال کر

کشکولِ خامشی میں کوئی شور بھر گیا
سکّوں کی طرح لفظ ہوا میں اچھال کر

جلتے ہوئے زخموں کا نشاں باندھ لیا ہے
یہ کس نے چراغوں کا دھواں باندھ لیا ہے

اک چھاؤں سے لہجے نے چھپا لی ہے کڑی دھوپ
اک رنگ نے سب رنگِ خزاں باندھ لیا ہے

کچھ لوگ ہیں جو ذہن کے کونوں میں پڑے ہیں
کچھ غم ہیں جنہیں زیرِ زباں باندھ لیا ہے

بکھری ہوئی اک راہگزر آنکھ میں رکھ لی
اور پشت پہ اک ٹوٹا مکاں باندھ لیا ہے

کس عکس کی حیرت ہے کہ ہر عکسِ دگر نے
آئینے میں آسیبِ گماں باندھ لیا ہے

کشتی کی ہر اک سانس میں روشن ہوا دریا
پتوار نے جب آبِ رواں باندھ لیا ہے

ہم اپنی منزلِ پرواز کا نشاں لے کر
اتر رہے ہیں زمینوں پہ آسماں لے کر

بچے کھچے ہوئے کچھ خواب بھی گنوا آئے
یقین بیچ رہا تھا کوئی گماں لے کر

پکارتا ہے ہمیں شام کے کنارے سے
کوئی سراپا تحیّر، چراغِ جاں لے کر

وہ گل عِذار، وہ گل پیرہن، وہ گل اندام
کہاں گیا چمنِ جاں کی تتلیاں لے کر

گزرتے دن کے تعاقب میں چلتے جاتے ہیں
گزشتہ رات کا آنکھوں میں ہم دھواں لے کر

کھڑے تھے دونوں بہت دیر سر جھکائے ہوئے
بکھرتے رشتوں کی آنکھوں میں کرچیاں لے کر

وہ تم ہی تھے یا کوئی اور تھا جو ہم کو نبیلؔ
تمام رات پھرا تھا یہاں وہاں لے کر

نہ جانے کون سی وحشت بھری تھی آہو میں
تمام دشت لیے اُڑ رہا تھا پہلو میں

رکھی ہوئی تھی اک امید، شب کی پلکوں پر
چمک رہے تھے کئی آسمان جگنو میں

میں عشق ہوں، کہاں ممکن ہے میری پیمائش
مرا جنوں نہیں آتا کسی ترازو میں

ہراک طرح سے اُسے آزما کے دیکھ لیا
کسی طرح بھی وہ آتا نہیں ہے قابو میں

کھلی جو آنکھ، نہ مہتاب تھا، نہ رات ، نہ تو
پڑا ہوا تھا میں اپنے بدن کے پہلو میں

رباعی ، مرثیہ ، دوہا، قصیدہ ، نظم ، غزل
کئی طرح کے نشے ہیں زبانِ اردو میں

ترے حضور عجب کیفیت ہے، کیا بولوں
زباں چپکنے لگی ہے نبیلؔ تالو میں

کون روشن دیارِ جان میں ہے
کس کی خوشبو ابھی مکان میں ہے

ختم ہونے کو ہے حکومتِ شب
اک نئی صبح شمعدان میں ہے

جانے کیا چیز ڈھونڈتی ہے نظر
جانے کیا چیز آسمان میں ہے

شور بہنے لگا ہے آنکھوں سے
خامشی آج امتحان میں ہے

اک طرف تم ہو ، اک طرف میں ہوں
ایک دیوار درمیان میں ہے

جال پھیلا ہوا ہے چاروں طرف
طائرِ دل مگر اڑان میں ہے

تری تلاش میں جاں سے گزرنے والا ہوں
مجھے سنبھال کہ اب میں بکھرنے والا ہوں

مرا طریقہ ذرا مختلف ہے سورج سے
جہاں پہ ڈوبا وہیں سے ابھرنے والا ہوں

میں اپنے ساتھ گئے موسموں کے رنگ لیے
نئی فضاؤں میں پرواز کرنے والا ہوں

یہ میرا عجز کہ مَیں سر جھکا کے ملتا ہوں
مگر وہ لوگ سمجھتے ہیں ڈرنے والا ہوں

وہ اک سوال کہ جس کا کوئی جواب نہیں
اُسی سوال کی تہ میں اترنے والا ہوں

نبیلؔ کوئی خبر کردے دشمنِ جاں کو
کہ اُس کے شہر میں کچھ دن ٹھہرنے والا ہوں

ہم سخن ہونے کو دیوار بھی تیار نہیں
ایسی تنہائی کہ اب مَیں بھی مرا یار نہیں

ہاں بس اتنا ہے کہ ملتا ہی نہیں تیرا سراغ
ورنہ اس دل کو ترے ہونے سے انکار نہیں

ہجر زادوں کی یہ بستی بھی عجب بستی ہے
ہجر کی رات ہے اور کوئی بھی بیدار نہیں

گردشِ وقت ٹھہر، دیکھ مری آنکھوں میں
رات سے شکوہ نہیں، صبح سے تکرار نہیں

میں وہ سورج جو ابھرتا ہے نئی صبح کے ساتھ
یہ مرا ڈوبنا اے دوست، مری ہار نہیں

خواب کیا آئیں گے ان وحشی آنکھوں میں نبیلؔ
نیند بھی آنے کے فی الحال کچھ آثار نہیں

مرا جنوں ، مری سانسیں، ترے سبب تو نہیں
تو میرادوست ہے ، ہمدم ہے، میرا رب تو نہیں

ہنسی مذاق، لطیفے، دھوئیں کے مرغولے
میاں! کبھی کبھی چلتا ہے روز و شب تو نہیں

چراغِ عشق ہے سینے کے درمیاں روشن
چمک جو میرے لہو میں ہے بے سبب تو نہیں

اچھال جاتا ہے ہر شخص ایک سکّۂ خواب
ہماری آنکھ کوئی کاسۂ طلب تو نہیں

کسی کسی سے ہی ملتا ہے سلسلہ دل کا
کوئی کوئی ہوا کرتا ہے دوست، سب تو نہیں

تلاش کر تو مرے ریتلے مناظر میں
یہیں کہیں ترے موسم ہوں کچھ عجب تو نہیں

طرح طرح کے بنے عکس دھیان سے باہر
دھوئیں کے رنگ کھلے، شمع دان سے باہر

زمیں سے کس نے اشارہ کیا خلا کی طرف
ستارے ٹوٹ گرے آسمان سے باہر

جسے بھی جانا ہو دربار، شوق سے جائے
ہمارا یوں ہے کہ بیٹھیں گے شان سے باہر

وہ جس کی سمت کھنچی جا رہی ہے خلق تمام
کوئی تو ہوگا زمین و زمان سے باہر

تجھے خبر ہی نہیں قصہ گو! کہ میں کب کا
نکل چکا ہوں تری داستان سے باہر

مدار چھوڑدے جس طرح کوئی سیارہ
کچھ اس طرح ہوئے ہم خاندان سے باہر

کوئی نہیں تھا کہیں بھی، کوئی نہیں تھا نبیلؔ
میں ڈر کے نکلا جو خالی مکان سے باہر

دھوپ کے جاتے ہی مر جاؤں گا مَیں
ایک سایہ ہوں، بکھر جاؤں گا مَیں

اعتبارِ دوستی کا رنگ ہوں
بے یقینی میں اتر جاؤں گا مَیں

دن کا سارا زہر پی کر آج پھر
رات کے بستر پہ مر جاؤں گا مَیں

پھر کبھی تم سے ملوں گا راستو!
لوٹ کر فی الحال گھر جاؤں گا مَیں

اب مرے لشکر میں ہیں وہ سب نبیلؔ
جو سمجھتے تھے کہ ڈر جاؤں گا مَیں

وہ دکھ نصیب ہوئے خودکفیل ہونے میں
کہ عمر کٹ گئی اپنی دلیل ہونے میں

مسافروں کے قدم ڈگمگائے جاتے تھے
عجب نشہ تھا سفر کے طویل ہونے میں

وہ ایک سنگ جو رستے میں ایستادہ تھا
اُسے زمانے لگے سنگِ میل ہونے میں

منافقین سے خطرہ کبھی غنیم کا خوف
قیامتیں ہیں بہت بے فصیل ہونے میں

عزیزؔ ہونے میں آسانیاں بہت سی تھیں
بہت سے درد ملے ہیں نبیلؔ ہونے میں

یہ کیسا سفر ہے جو ٹھہرنے لگا مجھ میں
یہ دشت ہے کیسا جو گزرنے لگا مجھ میں

یہ کون بلانے لگا مجھ کو مری جانب
یہ کون سرِ شام اترنے لگا مجھ میں

سمٹی ہوئی اک رات بکھرنے لگی ہر سو
کھویا ہوا اک چاند ابھرنے لگا مجھ میں

اک گمشدہ آواز نے آواز دی مجھ کو
اک نشۂ کمیاب اترنے لگا مجھ میں

پھر میں نے نبیلؔ آخری اک تیر نکالا
پھر جنگ کا میدان سنورنے لگا مجھ میں

گزرنے والی ہوا کو بتادیا گیا ہے
کہ خوشبوؤں کا جزیرہ جلادیا گیا ہے

بصارتوں کا ہوا تھا جہاں پہ قتلِ عام
وہاں اک آئنہ خانہ بنادیا گیا ہے

اُسی کے دم سے تھا روشن سیاہِ شب کا علَم
وہ چاند جس کو زمیں میں دبادیا گیا ہے

وہ ایک راز! جو مدّت سے راز تھا ہی نہیں
اُس ایک راز سے پردہ اٹھادیا گیا ہے

تمہیں خبر نہیں خانہ بدوش امیدو؟
نیا علاقہ سرِ جاں بسادیا گیا ہے

وقت کی آنکھ میں صدیوں کی تھکن ہے، میں ہوں
دھول ہوتے ہوئے رستوں کا بدن ہے، میں ہوں

پھر ترا شہر ابھر آیا ہے چاروں جانب
پھر وہی لوگ، وہی طرزِ سخن ہے ، میں ہوں

ایک تاریک ستارے کا سفر ہے درپیش
اور امید کی اک تازہ کرن ہے ، میں ہوں

ایک جنگل ہے، گھنے پیڑ ہیں، اور اک تالاب
اک شکاری ہے، کوئی زخمی ہرن ہے ، میں ہوں

کون بتلائے تجھے اے مرے ہمزاد نبیلؔ
تیرے ہمراہ جو اک اور بدن ہے ، میں ہوں

میں ایک دریا ہوں خواہشوں کا، بدن سے باہر چھلک رہا ہوں
تمہارے ساحل پہ اپنے جذبوں کی مست لہریں پٹک رہا ہوں

گزر گیا تھا میں اپنی رو میں، زمیں سے آگے، خلا سے آگے
سو اب میں اپنی روانی روکے، بچھڑنے والوں کو تک رہا ہوں

سنہرے خوابوں کی اک نئی کہکشاں چمکنے لگی ہے مجھ میں
گزشتہ خوابوں کی راکھ پلکوں سے دھیرے دھیرے جھٹک رہا ہوں

یہ کیسی حیرت تمہارے چہرے سے میری آنکھوں تلک کھنچی ہے
جدھر بھی دیکھوں بس ایک تم ہو، ہزار پلکیں جھپک رہا ہوں

یہ کیسی لکنت مری صداؤں میں حرف در حرف جم رہی ہے
نبیلؔ پہلی دفعہ ہوا ہے کہ بات کرتے اٹک رہا ہوں

اے اعتبار! دیکھ تری عمر گھٹ نہ جائے
آتا ہوا وہ شخص اچانک پلٹ نہ جائے

انجان پانیوں پہ بھروسا نہ کیجیے
کشتی سنبھالیے، کہیں کشتی اُلٹ نہ جائے

مت کھیل ہم سے، آخرِ شب کے چراغ ہیں
آنکھوں کی پتلیوں سے کہیں لَو لپٹ نہ جائے

اگنے لگی ہیں درد کی خودرو اُداسیاں
کشتِ بدن مِرا، کہیں کانٹوں سے اَٹ نہ جائے

بچ کر رہیں یہ شہرِ بغاوت ہے محترم!
دستار تو گئی ہے، یہ گردن بھی کٹ نہ جائے

خزاں کے بعد مری جاں بہار بھی آئی
مگر نبیلؔ کی وحشت میں کیا کمی آئی؟

یہ کس کے در پہ ستاروں کا کارواں اترا
ہوا کے دوش پہ خوشبو کی پالکی آئی

یہ کس کا خواب، مری خواب گاہ میں آیا
یہ کس کی نیند، مری آنکھ میں چلی آئی

میں اپنی جیت کے قصے سنا کے رونے لگا
اور اُس کی آنکھ میں بھی جانے کیوں نمی آئی

سنا گیا تھا کہ صحرا کو جا چکا ہے نبیلؔ
سنا گیا ہے کہ صحرا میں زندگی آئی

اسی لیے تو فضاؤں میں بے خودی کم ہے
کہ بانسری کے سُروں میں تری ہنسی کم ہے

بکھر رہی ہے ہواؤں میں اعتبار کی راکھ
اور انتظار کی مٹھی میں زندگی کم ہے

پرانے پیڑ کو چڑیاں نہ چھوڑ جائیں کہیں
بلا کی دھوپ ہے اور چھاؤں بھی گھنی کم ہے

پھر اُس کی سمت روانہ ہے جستجو میری
کہ جس خیال کے حصّہ میں شاعری کم ہے

بہت سے چاند ستارے اُگا رہا ہوں نبیلؔ
مری زمین پہ سورج کی روشنی کم ہے

وقت کی آنکھیں پڑھتے پڑھتے پتھر ہوگیا میں
رفتہ رفتہ خود کو تراشا، آذر ہوگیا میں

عمر گزاری گھر کا ہر اک کونا باندھ کے رکھنے میں
اور پھر اک دن اپنے گھر سے باہر ہوگیا میں

اک آواز لیے پھرتی تھی مجھ کو شہر بہ شہر
جانے کہاں کب پاؤں رکے اور پتھر ہوگیا میں

میں اک جگنو، کب تک لڑتا کالی راتوں سے
ایک تمہارے آجانے سے لشکر ہوگیا میں

جب سے اُن حیران آنکھوں نے نظریں پھیری ہیں
خواب تماشا ختم ہوا ، بے منظر ہوگیا میں

جانے کن راہوں سے اس شہر میں لایا گیا ہوں
ایسا لگتا ہے یہاں پہلے بھی آیا گیا ہوں

میں تو گھر ہی میں ہوں، پر لوگ بتاتے ہیں کہ مَیں
دشت و صحرا میں بھٹکتا ہوا پایا گیا ہوں

کاش اک روز کوئی چھو کے بتائے مجھ کو
کون ہوں؟ کون سی مٹّی سے بنایا گیا ہوں

میرے قدموں میں ستارے تھے مرے ہاتھ میں چاند
مدّتوں، مَیں سرِ افلاک سجایا گیا ہوں

اتنی حیرت سے عزیزم! تو مری سمت نہ دیکھ
میں یہاں خود نہیں آیا ہوں، بلایا گیا ہوں

کمال یہ ہے کہ اے دوست عرضِ حال نہ کر
جواب خود ہی چلے آئیں گے ، سوال نہ کر

بلندیوں کے سفر میں بکھر نہ جانا کہیں
ہوا کی شہ پہ مری جان یہ کمال نہ کر

مرے خدا! مجھے منظور سچ کی تنہائی
مگر کبھی کسی جھوٹے کا ہم خیال نہ کر

جہاں پہنچ کے ہر اک شے میں تو نظر آئے
اب اُس مقام پہ لاکر مجھے نڈھال نہ کر

مجھے بکھیر دے صحرا کی وسعتوں میں نبیلؔ
مرا جنوں ہے سلامت، مجھے بحال نہ کر

بہت اچھی نہیں ہے صاحبا! قربت ہماری
بگاڑے گی تمہیں بھی ایک دن صحبت ہماری

ہمارا ہجر کیا ہے روشنی کا ایک وقفہ
اسی وقفے میں ہے سمٹی ہوئی وسعت ہماری

اُدھر آباد ہیں ہر آنکھ میں آئینہ خانے
لیے جاتی ہے ہم کو جس طرف حیرت ہماری

اٹھا کر لے گئی ہم کو روانی پانیوں کی
کناروں کی تھکن میں جذب تھی ہجرت ہماری

میاں تم کیا خریدو گے ہمارے خواب، جاؤ!
لگا سکتے نہیں نیندوں کی بھی قیمت ہماری

بے سمت قافلوں کو اشارہ ہوا نصیب
تاریک راستوں میں ستارا ہوا نصیب

اک خواب پھر سے جاگ اٹھا مدّتوں کے بعد
اک جستجو کا ساتھ دوبارہ ہوا نصیب

جب سچ کو ہم نشین کیا ہے تو دوستو
کیا سوچنا کہ کتنا خسارا ہوا نصیب

سورج سے دشمنی کا نتیجہ بھی دیکھ لو
اک آسماں سیاہ، تمہارا ہوا نصیب

موہوم ساحلوں کے تحیّر میں گم نبیلؔ
ہم رک گئے جہاں بھی کنارہ ہوا نصیب

رابطے توڑ کر جانے والا گیا ، ہم نے روکا نہیں
کس نے کیا پالیا، کس نے کیا کھودیا، ہم نے سوچا نہیں

ایک پرچھائیں تھی، ایک روشن دیا، رات گہری ہوئی
تیز آندھی چلی اور پھر کیا ہوا، ہم نے دیکھا نہیں

بس یہ دیکھا کہ سورج کی کرنوں میں کوئی ندامت سی تھی
ڈوبتے چاند نے صبح سے کیا کہا، ہم نے پوچھا نہیں

رات آئی تو آنکھوں کے محراب میں رتجگے جل اٹھے
خواب کا سلسلہ، نیند کا راستہ، ہم نے ڈھونڈا نہیں

چند ٹوٹی صدائیں اٹھائے پھرے، شاعری کب ہوئی
ہاں مگر حرمتِ لفظ کا دائرہ ہم نے توڑا نہیں

خوابوں سے بچھڑنا مجھے منظور نہیں تھا
حالانکہ میں تعبیر سے کچھ دور نہیں تھا

یہ کیسا سفر آ کے مرے پاؤں لگا ہے
اب وہ بھی بہت دور ہے جو دور نہیں تھا

یہ کیا ہوا ہر آنکھ مروّت سے ہے خالی
ایسا تو مرے شہر کا دستور نہیں تھا

اس فیصلۂ جبر پہ ہم جان سے گزرے
وہ فیصلہ، اس دل کو جو منظور نہیں تھا

نشانِ راہ نہ ہو، سایۂ شجر بھی نہ ہو
جنوں تمام نہ ہو، راہ مختصر بھی نہ ہو

یہ حکم ہے کہ اڑانیں بھرو، فلک چھولو
مگر ہے شرط ، ہواؤں کو کچھ خبر بھی نہ ہو

اک ایسی صبح کا ماتم جو راکھ ہوچکی ہے
اک ایسی رات کا غم ، ہم سے جو بسر بھی نہ ہو

عجب عذاب میں یہ شہر مبتلا ہے نبیلؔ
کہ لوگ روتے رہیں، کوئی آنکھ تر بھی نہ ہو

ہمارے خواب کی تشکیل ہو رہی ہے ابھی
یہ رات نیند میں تحلیل ہو رہی ہے ابھی

یہ کس کا ذکر دھڑکنے لگا درونِ دل
یہ کس کے درد کی ترسیل ہو رہی ہے ابھی

امیرِ شہر سے مت کیجئے سوال جواب
فسادِ شہر کی تاویل ہو رہی ہے ابھی

نبیلؔ آ! میں ہوں، مری وحشتیں ہیں، صحرا ہے
جنونِ شوق کی تکمیل ہو رہی ہے ابھی

بیادِ مرزا اطہر ضیاء

شدید رنج ، غم و حزن، انتہائی دکھ
تمہارے بعد بچی اپنی ''کل کمائی'' دکھ

ہر اک خیال ہر اک خواب کی اِکائی دکھ
تمام حرف و صدا اور سخن سرائی دکھ

وہاں سے آگے بھی بس تم تھے اور تمہاری یاد
جہاں تلک مجھے دیتا رہا رسائی دکھ

نہ جانے کون گیا چھوڑ کر زمانے کو
وہ درد اٹھا، کہ دینے لگا دُھائی دکھ

سمیٹ رکھتا ہے اک رشتۂ ابد میں نبیلؔ
کسی طرح نہیں دیتا مجھے رہائی دکھ

مجھ میں سمٹی رات کا منظر بدلتا کیوں نہیں
مدتیں گزریں کوئی سورج نکلتا کیوں نہیں

منجمد ہونے لگا اظہار کا پورا بدن
یہ مری آواز کا چہرہ پگھلتا کیوں نہیں

وہ لہو، غرقاب ہے جس کی تہوں میں روشنی
میری آنکھوں کے کناروں سے ابلتا کیوں نہیں

تیرے سب ٹوٹے ستارے ڈھونڈنے نکلا ہوں میں
اے فلک! تو بھی مرے ہمراہ چلتا کیوں نہیں

مستقل اک انحرافی کیفیت کی زد میں ہوں
کوششوں کے بعد بھی لہجہ بدلتا کیوں نہیں

کچھ نہیں جان کے بھی، یوں ہے کہ سب جانتے ہیں
ایک ہم ہی تری وحشت کا سبب جانتے ہیں

اک تعارف تو ضروری ہے ، سرِ راہِ جنوں
دشت والے نئے برباد کو کب جانتے ہیں

رات اتری ہے دل و جاں میں ستارے لے کر
وہ ستارے جو اداسی کا سبب جانتے ہیں

پہلے کب وہ ہمیں اس طرح سے پہچانتے تھے
اب لقب جانتے ہیں، نام و نسب جانتے ہیں

ہم کو مت جانیے کم ہوش کہ ہم لوگ نبیلؔ
سب کو پہچانتے ہیں ، حدِ ادب جانتے ہیں

صبح جب رات کے زندان سے باہر آئی
روشنی، سوچ کے ایوان سے باہر آئی

شامِ غم میں نے جو پوچھا مرا غمخوار ہے کون؟
اک غزل میرؔ کے دیوان سے باہر آئی

میں نے تھک ہار کے جب زادِ سفر کھولا ہے
ایک امید بھی سامان سے باہر آئی

کس کے چہرے کی چمک جاں میں سمونے کے لیے
زندگی دیدۂ بے جان سے باہر آئی

میں نے کچھ رنگ اچھالے تھے ہواؤں میں نبیلؔ
اور تصویر تری، دھیان سے باہر آئی

عزیز نبیل کے پہلے مجموعۂ کلام

'خواب سمندر'

سے ۵۰ منتخب اشعار

(مطبوعہ ۲۰۱۱ء)

جس طرف چاہوں پہنچ جاؤں مسافت کیسی
میں تو آواز ہوں آواز کی ہجرت کیسی

میں کسی آنکھ سے چھلکا ہوا آنسو ہوں نبیلؔ
میری تائید ہی کیا، میری بغاوت کیسی

....

نہ جانے کس کے قدم چومنے کی حسرت میں
تمام راستے دل کی طرح دھڑک رہے تھے

کوئی جواب نہ سورج میں تھا نہ چاند کے پاس
مرے سوال سرِ آسماں چمک رہے تھے

اب ہمیں چاک پہ رکھ یا خس و خاشاک سمجھ
کوزہ گر ہم تری آواز پہ آئے ہوئے ہیں

....

بہکا تو بہت بہکا ، سنبھلا تو ولی ٹھہرا
اُس چاک گریباں کا ، ہر رنگ نرالا تھا

....

حیات و کائنات پر کتاب لکھ رہے تھے ہم
جہاں جہاں ثواب تھا عذاب لکھ رہے تھے ہم

سوال تھا کہ جستجو عظیم ہے کہ آرزو
سو یوں ہوا کہ عمر بھر جواب لکھ رہے تھے

....

ہم قافلے سے بچھڑے ہوئے ہیں مگر نبیلؔ
اک راستہ الگ سے نکالے ہوئے تو ہیں

....

ہر اک منظر بھگونا چاہتی ہے
اداسی خوب رونا چاہتی ہے

....

اِس بار تو خدا کی قسم کچھ نہیں کہا
کیوں اڑ گیا جناب کے چہرے کا رنگ پھر

بہت ہی خوب تھی سردار تیری سرداری
قبیلہ جنگ میں تھا تو رہِ فرار میں تھا

....

قلم ہے ہاتھ میں کردار بھی مرے بس میں
اگر میں چاہوں کہانی بدل بھی سکتا ہوں

اُسے کہو کہ گریزاں نہ یوں رہے مجھ سے
میں احتیاط کی بارش میں جل بھی سکتا ہوں

....

وہ شہرِ حیرت کا شاہ زادہ گرفتِ ادراک میں نہیں ہے
اس ایک چہرے کی حیرتوں میں ہزار آنکھیں سما چکی ہیں

ہم اپنے سر پر گزشتہ دن کی تھکن اٹھائے بھٹک رہے ہیں
دیارِ شب! تیری خواب گاہیں تمام پردے گرا چکی ہیں

....

کیوں نہیں دیکھتا ہے وہ مڑ کر
مر گئیں راہ میں صدائیں کیا

....

میں اگر ٹوٹا تو سارا شہر بکھرے گا نبیلؔ
ایسا پتّھر ہوں فصیلِ شہر کی بنیاد کا

اک سنگ تم بھی پھینک دو میری طرف نبیلؔ
میں چاہتا ہوں سارے زمانے سے اختلاف

....

چپکے چپکے وہ پڑھ رہا ہے مجھے
دھیرے دھیرے بدل رہا ہوں مَیں

میں نے سورج سے دوستی کی ہے
شام ہوتے ہی ڈھل رہا ہوں مَیں

....

تب کہیں جھکایا ہے سر غرورِ شاہی نے
جب اٹھا لیا سر پر تخت بے گناہی نے

کیا عجب عدالت ہے کیا عجیب منصف ہیں
دن کو قید میں ڈالا رات کی گواہی نے

....

زخم سہہ لیتا سبھی میں تیر سے تلوار تک
بات آ پہنچی مگر سر سے مری دستار تک

سوچ کا ہر زاویہ الجھا ہے ریشم کی طرح
فیصلے بکھرے پڑے ہیں ذہن سے اظہار تک

عادتاً سلجھا رہا تھا گتھیاں کل رات میں
دل پریشاں تھا بہت اور مسئلہ کوئی نہ تھا

....

میں چھپ رہا ہوں کہ جانے کس دم
اتار ڈالے لباس مجھ کو

....

میری آوارگی کے قدم چوم کر
رقص کرتی رہی رہ گزر دیر تک

....

ورنہ کیا ہے جو دسترس میں نہیں
صرف تو ہے جو میرے بس میں نہیں

صبر آیا ہے ایک عمر کے بعد
ایک دو چار چھ برس میں نہیں

....

کتنے آنسو جذب کرے گی چھاتی میں
یوں لگتا ہے دھرتی اب پھٹ جائے گی

سارے سپنے باندھ رکھے ہیں گٹھری میں
یہ گٹھری بھی اوروں میں بٹ جائے گی

تمام شہر کو تاریکیوں سے شکوہ ہے
مگر چراغ کی بیعت سے خوف آتا ہے

....

یہ دریا کچھ زیادہ ہنس رہا ہے
اِسے صحرا کی جانب موڑ دوں کیا

....

سفر درپیش ہے ایسا کہ جس میں
کئی سمتوں میں چلنا پڑ رہا ہے

....

ظلم پر خاموش رہنا جرم ہے
ہم بھی شامل ہیں گنہگاروں کے بیچ

....

آنکھوں کی کائنات میں خوابوں کا اک ہجوم
تعبیر کی تلاش میں سویا نہیں کبھی

....

پھر نئے سال کی سرحد پہ کھڑے ہیں ہم لوگ
راکھ ہو جائے گا یہ سال بھی، حیرت کیسی

....

تم نے آواز کو زنجیر سے کسنا چاہا
دیکھ لو ہوگئے اب ہاتھ تمہارے زخمی

ہم نے جن لفظوں کو اشعار کی خلعت بخشی
کیا قیامت ہے کہ مغرور ہوئے جاتے ہیں

....

کئی دریاؤں کی حاجت ہے مجھ کو
کئی صحرا ہیں میری تشنگی میں

کئی مصروف سڑکوں سے گزر کر
پہنچ جاتا ہوں اک سونی گلی میں

....

کھینچ لیتے ہیں ہواؤں کی رگوں سے پانی
جب کسی وادیٔ بے آب میں کھو جاتے ہیں

چند لمحے جو ملاقات کے ملتے ہیں کبھی
وہ بھی اکثر ادب آداب میں کھو جاتے ہیں

....

اور کچھ دیر ٹھہر اے مرے خوش رنگ خیال
ذہن الجھا ہے ابھی ایک ضرورت کی طرف

....

میرا لباس سچ ہے وہی زیب تن بھی ہے
اور میرے پاس دوسری پوشاک بھی نہیں

آرزوؤں کی پیاس ہے دنیا
ایک خالی گلاس ہے دنیا

....

قید کرکے گھر کے اندر اپنی تنہائی کو مَیں
مسکراتا گنگناتا گھر سے باہر آ گیا

....

کل چاند ڈگمگا کے سمندر میں گر گیا
پھیلے ہوئے ستاروں کی بندش کے باوجود

....

یہ بوندیں پہلی بارش کی ، یہ سوندھی خوشبو ماٹی کی
اک کوئل باغ میں کوکی ہے، آواز یہاں تک آئی ہے

عزیز نبیلؔ ہمارے عہد کے غیر معمولی شاعر ہیں۔
ان کے اشعار کے موضوعات، لہجہ، لفظیات، اور مناظر سب انہیں غیر معمولی بناتے ہیں۔ ان کی غزل کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ہم ان کے اشعار میں کچھ ہوتا اور گزرتا ہوا بہت آسانی سے دیکھ سکتے ہیں، محسوس کر سکتے ہیں۔ شعر میں ان کے اکثر بیانیے متحرک اور سیال ہیں، کسی فلسفیانہ وضاحت کی طرح جامد اور ٹھوس نہیں ہیں۔ قواعد کی اصطلاح میں یہ بات اس طرح بھی کہی جا سکتی ہے کہ فعل ان کے ہر شعر میں نظر آتا ہے۔ ان کی غزلوں کی اکثر ردیف ہی لفظ فعل سے ترکیب پاتی ہے۔ مثلاً جلتی ہوئی، جانتا ہوں، نکلی، آؤ تو سہی، کھلتے ہیں، چاک دامانی بھی کرتے ہیں، اٹھائے ہوئے، ابھر آیا ہوں، تہمت رکھ دی، ابھر چکا ہوں وغیرہ۔ شاعر جب زندگی اور اس کے مختلف مظاہر کو دیکھنے اور اس پر عمل کرنے کا تجربہ کر چکتا ہے تب جا کر اس کے بیان میں یہ معنی خیز حرکت پیدا ہوتی ہے ورنہ جامد لفظوں سے بنے ٹھوس اشعار کی بے رنگ غزلوں سے رسائل اور کتابوں کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔ الّا ماشاءاللہ

عزیز نبیلؔ کی غزل اس لیے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں جدید طرزِ احساس کے ساتھ روایت کا واضح احترام ملتا ہے اور یہ دونوں خوبیاں مل کر ان کی غزل کو بہت توانا، شائستہ اور دلکش بنا دیتی ہیں۔ ان کے بہت اچھے اشعار تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ اس مختصر تحریر میں ان کا عشرِ عشیر بھی نقل نہیں ہو سکتا۔ کلاسیکی شاعری کے مطالعے، زندگی کے رنگا رنگ تجربے، دنیا کے مشاہدے اور میرؔ سے لے کر عرفان صدیقی تک پھیلی ہوئی اردو غزل کی توانا روایت سے مضبوط وابستگی نے انہیں ایک ایسا محبوب شاعر بنا دیا ہے جو کوشش کر کے بھی خراب شعر نہیں کہہ سکتا۔

سیّد محمد اشرف ______

عزیز نبیلؔ کا پیرایۂ بیان بالواسطہ اور استعاراتی ہے۔ اچھی شاعری کی پہلی پہچان یہی ہے کہ وہ 'سپاٹ بیانیہ' اور 'اظہارِ حال' کی جگہ استعارے کو بیش از بیش اختیار کرتی ہے۔ عزیز نبیلؔ اِلیٹ کے اس قول سے واقف معلوم ہوتے ہیں کہ کوئی کلام جس قدر جدید ہوگا، اسی قدر اس میں کلاسیک کی بالواسطہ جلوہ گری ہوگی۔ انہوں نے عصر حاضر اور عہدِ قدیم دونوں کے غزل گویوں سے کسبِ فیض کرنے کی کوشش کی ہے۔ لہجے کی سطح پر بھی ان کی غزلیں جدید حسیت کا اظہار معلوم ہوتی ہیں۔ طنز اور دروں بینی ان کے خاص انداز ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی

زبان کے منطقے میں جنم لینے والے شعراء کا سب سے اہم نقص یہ ہوتا ہے کہ وہ بہت سہولت سے خراب شعر کہنے پر قادر ہوتے ہیں، مقامِ شکر ہے کہ عزیز نبیلؔ کی غزلیں اس عیب سے پاک ہیں۔ نئی زمینیں، نئی لفظیات، نئے تلازمے اور سب سے بڑھ کر نیا طرزِ احساس عزیز نبیلؔ کی شاعری کی بنیادی شناخت ہے۔ غزل میں کھردرا پن اپنا ایک حسن رکھتا ہے مگر رس میں ڈوبے ہوئے مصرعوں کی اپنی ایک شان ہوتی ہے جو دامنِ دل کو کھینچتے ہیں۔ نبیلؔ کی رس میں ڈوبی ہوئی ان غزلوں کا جب آپ مطالعہ کریں گے تو میری اس بات کی تصدیق کیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

افتخار عارف

روز دستک سی کوئی دیتا ہے سینے پہ نبیلؔ
روز مجھ میں کسی آواز کے پر کھلتے ہیں

Scholar Publishing House
H No. A-14/1,2nd Floor, Shaheen Bagh,
Abul Fazal Enclave, Part 2 Jamia Nagar, New Delhi.110 025
Mob: 8130115854, Email: scholarpublishinghouse@gmail.com